سیپیاں محبت کی
رضیہ سبحان قریشی

تیری دنیا میں جینے کا ہُنر پانا ضروری ہے
ہمیں اس کے اثر سے اب نکل جانا ضروری ہے

کہاں تک ترکِ اُلفت کا سبب بتلائیں دنیا کو
بس اتنا جان لو اُس سے بچھڑ جانا ضروری ہے

وہ اُس کا وعدہ اُلفت جو ہر اِک شے سے بڑھ کر تھا
بنائے مصلحت اُس سے مکر جانا ضروری ہے

مخالف سمت چلنے کی بنالی اب تو عادت سی
وہ جب آئے اِدھر، اپنا اُدھر جانا ضروری ہے

کبھی تو چاند تاروں سے کبھی پھولوں سے باتیں کیں
کہ اُس آسیبِ تنہائی کو بہلانا ضروری ہے

پرستش جس کی ہم نے کی وہ بس اِک آدمی نکلا
سو اُس کا حجرۂ دل سے اُتر جانا ضروری ہے

مجالِ ترکِ اذنِ آرزو کیسے ہو ممکن جب
کوئی نظروں ہی نظروں میں کہے 'آنا ضروری ہے'

سیپیاں محبت کی

سیپیاں محبت کی

رضیہ سبحان قریشی

RAZIA SUBHAN QURESHI
A-374, Block-D,North Nazimabad.Karachi
Ph: Res. 021- 6631181 Off: 021- 6638049

کتاب کا نام	سیپیاں محبت کی
شاعرہ	رضیہ سبحان قریشی
نگراں	اوج کمال
کمپوزنگ	محمد شہزاد شفیق
اشاعت	2006ء
قیمت	=/150روپے

تقسیم کار: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
فون021-2639581 / 021-2633151

زیر اهتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
623،6thفلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر، ریگل چوک، صدر، کراچی۔74400 پاکستان
Ph: 92-21-2744987 / 0212018365 Cell: 0300-2797271

نواسے اور نواسیوں

زنیر، زین، سمرا اور علینہ

کی معصوم دھڑکنوں کے نام

سچ کہوں اے جانِ جاں
مال و زر کی دنیا میں
بے بہا خزانہ ہیں
سیپیاں محبت کی

فہرست

تجربے کی تپش

شاعری تمام فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ مقبول اور متاثر کن ذریعہ اظہار ہے۔ ارسطو نے شاعری کو انسانی ذہن کا آزاد عمل قرار دیا ہے۔ اسی لیے ایک ہی معاشرے میں رہنے اور ایک جیسے تجربات سے گزرنے کے باوجود ہر شاعر کا اسلوب اور اندازِ بیان مختلف ہو جاتا ہے پھر شاعری اگر خود آگہی اور جہاں آگہی پر مبنی ہو تو وہ خود شاعر کے وجود کی پیمائش کا اشارہ بھی بن سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے رضیہ سبحان قریشی کے تیسرے شعری مجموعے ''سیپیاں محبت کی'' پڑھ کر ہوا۔ اس سے قبل اُن کی شاعری کی دو کتابیں ''سرد آگ'' اور ''خاموش دستک'' شائع ہو چکی ہیں۔ ان تینوں کتابوں میں رضیہ نے زندگی کے جو نشیب و فراز طے کیے ہیں اُن کا پورا شعور موجودہ کلام میں جھلکتا ہے۔ انہیں خود بھی احساس ہے کہ تجربے کی تپش نے اُن کے طرزِ احساس کو کندن بنا دیا ہے اب وہ ''ایک ایسی شخصیت بننا چاہتی ہیں جس میں دریاؤں کی طغیانی نہیں بلکہ سمندر کا سا ٹھہراؤ ہو''۔ اس کے آگے وہ ایسی منزلوں کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتی ہیں جہاں روح کو سکون اور آتما کو شانتی ملے، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ محبت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ بقول میر تقی میرؔ

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور

''سیپیاں محبت کی'' غزلوں اور نظموں کے موتیوں سے یقیناً اہلِ ادب کو اپنی طرف متوجہ کریں گی۔ اُن کی نظم ''کربِ آگہی'' خصوصیت کے ساتھ رضیہ سبحان قریشی کے مزاج اور

آدرش کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے۔ "سیپیاں محبت کی" میں ایسے لطیف اور نازک اشعار کی کمی نہیں۔

اِک اس خیال نے ہمیں چونکا دیا بہت
پھر فرصتِ خیال ہمیں جانے کب ملے

مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں رضیہ سبحان قریشی کی "سیپیاں محبت کی" خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی۔

پروفیسر سحر انصاری

حرفِ آغاز

زندگی کی ''سرد آگ'' کی چنگاریاں سلگاتے ہوئے اور پھر ''خاموش دستک'' دیتے ہوئے میں آپ کے لیے ''سیپیاں محبت کی'' لے آئی ہوں۔

اپنی تخلیق کو نام دینا بے حد مشکل کام ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے والدین کو اپنے بچے کا اسم تجویز کرنا۔ جب تک بچہ دنیائے وجود میں نہیں آجاتا، ماں اور باپ آپس میں نام ہی تجویز کرتے رہتے ہیں۔ یہ نام۔۔۔ نہیں وہ۔۔۔ نہیں یہ پرانا ہے۔۔۔ یہ بے معنی ہے۔۔۔ یہ نیا ہے یہ کتنا خوبصورت نام ہے۔۔۔ اور جب بچہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو دادا یا دادی، نانا یا نانی فوراً اپنا حق جتا کر بچے کا نام رکھ جاتے ہیں اور حکم صادر کرتے ہیں کہ بچے کو اسی نام سے پکارا جائے۔ ماں باپ آپس میں منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس تمہید کا مطلب یہ ہے کہ میری پہلی دو کتابوں کے نام بے ساختہ رکھے گئے تھے یعنی کسی مشورے کے بغیر، مگر اب میرے بچے بڑے ہو چکے ہیں اور اتنے بڑے کہ وہ میری تخلیق کا نام رکھ گئے۔۔۔ میں کچھ نہ کہہ سکی!

امی اس کتاب کا نام ہم رکھیں گے۔ میں انکار نہ کرسکی ''سیپیاں محبت کی'' بالکل اُس طرح پیارا نام ہے جیسے میرے بچوں کا۔۔۔ موتا، بینا، حمنہ اور اسعد

میری غزلیں اور نظمیں محبت کی وہ سیپیاں ہیں جو زیست کے ساحل پر بکھری ہیں، مختلف رنگوں میں مختلف شکلوں میں، یہ وہ سیپیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اور جنہیں چھو کر آپ کے دل میں مسرت کا عجیب سا احساس جاگے گا، یہ وہ سیپیاں ہیں جو آپ کے سرہانے پڑی رہیں گی، جب بھی آپ مایوس ہوں، تنہا ہوں، افسردہ ہوں، زمانے سے نالاں ہوں، تلاطم وقت کا شکار ہوں،

مصائب و مسائل میں گھرے ہوں یا بے خوابی کی زد میں۔ اِن سیپیوں کو ہاتھ میں لے لیں، مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو اُس اندھیرے سے نکال لیں گی جو مایوسی اور احساسِ شکست کا اندھیرا ہے خواہ وہ وقتی طور پر ہی سہی۔ یہ آپ کے اندر ایک تازہ روح، اِک نئی فکر و آگہی اور اِک نیا شعور بیدار کر دیں گی کیونکہ یہ سیپیاں محبت کی سیپیاں ہیں جو صرف اور صرف محبت کی جھنکار سناتی ہیں، محبت کے نت نئے رنگ بکھیرتی ہیں اور اِس محبت کی قوس و قزح میں آپ نکھر جائیں گے، سنور جائیں گے اور ہو سکتا ہے اِن سیپیوں کو چنتے چنتے آپ بھی کوئی انمول موتی پالیں!!

ساتھیو! میری پہلی کاوش ''سرد آگ'' میں جھجک تھی۔ دوسری کتاب ''خاموش دستک'' میں شکوہ تھا اور یہ کتاب ''سیپیاں محبت کی'' میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ انسان جوں جوں عمر کی منزلیں طے کرتا ہے اُس میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اُس کے اندر بے شمار ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے ظاہری حسن کا سورج جوں جوں وقت کے ساتھ ڈھلنے لگتا ہے اُسی قدر روحانی بالیدگی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ میں بھی زندگی کے اِس سفر میں اُس موڑ پر ہوں جہاں ظاہری حسن سے زیادہ روحانی حسن متاثر کرتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ اب میں کتابِ زندگی کو بحسن و خوبی پڑھنے لگی ہوں، سمجھنے لگی ہوں مگر زندگی میں ابھی اپنے ردِعمل پر اختیار نہ حاصل کر سکی۔ شخصیت میں بظاہر پختگی نظر آتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے آپ پر مکمل دسترس نہ حاصل کر سکی اور میرے خیال میں ہر انسان عمر کی ہر منزل میں شاید اِسی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ نہ جانے کتنے کامیاب ہو پاتے ہیں۔ مجھے ابھی اور وقت چاہئے کہ زندگی کو، اُس کے اُصولوں کو جتنا سمجھا ہے اُن پر پوری طرح عمل پیرا ہو سکوں۔ میں ایک ایسی شخصیت بننا چاہتی ہوں جس میں دریاؤں کی طغیانی نہیں بلکہ سمندر کا ٹھہراؤ ہو، ہوا کی بے لگامی نہیں بلکہ بادِ نسیم کے ہچکولے ہوں، گھٹاؤں کی گھن گرج نہیں بلکہ بادلوں جیسی بردباد روشنی ہو، زبان میں جھوٹ کی چاشنی نہیں بلکہ سچ کا کھرا پن ہو، آنکھوں میں رنگین سپنے نہیں بلکہ تلخ حقیقت

کی تصویریں ہوں، سوچ میں تذبذب نہیں بلکہ اعتماد اور یقین کا عنصر ہو، کاش مجھے تصوف اور آگہی کی وہ منزل نصیب ہو جس کی میں تمام عمر متلاشی رہی، کاش!!!

میں جانے کیا کچھ کہہ گئی، یقین جانیے میں سوچ کر نہیں لکھتی، میری فکر اس آبشار کی مانند ہے جو اپنی راہ میں کسی رکاوٹ کو رکاوٹ نہیں بننے دیتی بلکہ اپنا راستہ بناتی چلی جاتی ہے۔ امید ہے آپ میری اس تازہ فکر سے مستفید ہوں گے۔ اپنی سچی رائے سے مجھے ضرور آگاہ کریں تاکہ میں اس کی روشنی میں آگے بڑھ سکوں۔

رضیہ سبحان قریشی

حمد

بیاں تعریف ہو تیری کہاں طاقت زباں میں ہے
کہ ہر اک سُو ترا جلوہ زمین و آسماں میں ہے

تو مظہر عدل و نیکی کا، سخاوت کا محبت کا
ہر اِک تخلیق تیرا عکس ہے جو اس جہاں میں ہے

میں اِک ادنیٰ بشر ہوں اور تو شاہا دو عالم کا
طلب مجھ کو اُسی رحمت کی جو ارض و سماں میں ہے

تکبرّ نیکیوں کا ہے، نہ شرمندہ گناہوں پر
مثالِ آئینہ ہستی مری تیری اماں میں ہے

حمد

ثنا میں تیری ازل سے لے کر
ابد تلک وقت کا سفر ہے
رحیم و رحماں، بلند و واحد
جدا ہے سب سے، عظیم تر ہے
زمانے بھر کے لیے مسیحا
مرے لیے بھی تو چارہ گر ہے
سو مجھ کو اپنے حصار میں لے
کہ تیری دامِ اسیر رہ کر
میں زندگی کے ہر اک فسوں سے

ہر ایک فتنہ، فساد و شر سے
ہر ایک برقاب و روشنی سے
ہر ایک بازارِ سرکشی سے
ہر ایک زنجیر خودسری سے
ہر ایک زندانِ رنگ و بو سے
زمین کینہ ہر اک نفس سے
بچا کے شیطاں سے دامنِ دل
رہوں میں تیری اماں میں ہر دم

نعتؐ

تسکیں، سکوں، قرار محمدؐ کے نام سے
اِس دل کا کاروبار محمدؐ کے نام سے

نقش و نگارِ زیست اِسی نام کے سبب
ہر ساعتِ بہار محمدؐ کے نام سے

مقبول ہوں دُعائیں سبھی حاضرین کی
جذبوں کا اعتبار محمدؐ کے نام سے

نعتؐ

یا محمدؐ کی ہر سو صدا چاہیے
مجھ کو طیبہ کی مہکی فضا چاہیے

دودھیا روشنی سے منور رہوں
کملی والے کی کالی رِدا چاہیے

سانس لینے کو اسمِ محمدؐ بہت
زندگی کو یہ تازہ ہوا چاہیے

کیوں نہ سرسبز ہو فکر کی سرزمیں
جب خیالِ محمدؐ اُگا چاہیے

روح میں نشۂ اسمِ محبوبِ رب
جسم پر رحمتوں کی گھٹا چاہیے

مدحتِ مصطفےٰؐ کا ہنر آ گیا
مجھ گناہگار کو اور کیا چاہیے

•

نعتؐ

بُلبلِ شہرِ مدینہ کی نوا کچھ اور ہے
اِس دیارِ حُسن کی آب و ہوا کچھ اور ہے

آستانِ مصطفیٰؐ کی بات ہے سب سے الگ
شہرِ طیبہ کی فضاؤں کا نشہ کچھ اور ہے

وہ مجسم رنگ و خوشبو نور میں ڈوبے ہوئے
اُن کے در سے روشنی کا سلسلہ کچھ اور ہے

میں نے چھانی خاک در در کی مگر سچ ہے یہی
اُن کی گلیوں سے گزرنے کا مزا کچھ اور ہے

زندگی کا سحر ٹوٹا گنبد خضریٰ کے پاس
یاں گدائے مصطفیٰؐ کی ہر صدا کچھ اور ہے

شکر ہے عشقِ نبیؐ کا معجزہ ظاہر ہوا
اب مرے قلبِ حزیں کا حوصلہ کچھ اور ہے

کاش آنکھیں بند ہوں جا کر مدینے میں مری
کہ یہاں جامِ اجل کا ذائقہ کچھ اور ہے

حرصِ مال و زر سے بیگانہ ہوا جب سے یہ دل
لب پہ رضیہؔ کے تو اب حرفِ دُعا کچھ اور ہے

مولا علیؓ مشکل کشا

شمس و قمر تجھ پہ فدا
مولا علیؓ مشکل کشا

تم ہو علامت عقل کی
تم ہو ضمانت عدل کی
ضیغم صفت، نورِ ہدیٰ
مولا علیؓ مشکل کشا

قدسی صفت مولیٰ لقب
خندہ جبیں، عالی نسب
عکسِ جمالِ مصطفٰے
مولا علیؓ مشکل کشا

علم الیقیں، عین الیقیں
حق الیقیں، اے سرِ دیں
روشن صفاتِ دلربا
مولا علیؑ مشکل کشا

املاک تیری سادگی
دستار تیری ملگجی
درسِ محبت بھی جدا
مولا علیؑ مشکل کشا

•

○

سر پہ اپنے تھا کبھی جو سائباں جاتا رہا
کیا کہیں کیونکر متاعِ کارواں جاتا رہا

قربتیں جب سے میسر ہیں کسی گلرنگ کی
زندگی سے اپنی ہر غم کا نشاں جاتا رہا

کیا بتائیں زخم سہنے کا صلہ کیوں کر ملا
"ہے زیاں موجود، احساسِ زیاں جاتا رہا"

چھن گئی اس دم ہماری زندگی کی ہر خوشی
جس گھڑی محفل سے دل کا ترجماں جاتا رہا

جانے کس کی آہ کے زیرِ اثر ہیں آج تک
کہ دھواں ہر دم سوئے آستاں جاتا رہا

O

اپنی ہستی سنوارنا فن ہے
زندگی کو گزارنا فن ہے

جس پہ غم کی ہزار ہا شکنیں
ایسا چہرہ نکھارنا فن ہے

جو رہے روبرو سراب نُما
اُس کو دل میں اُتارنا فن ہے

جو سراپا عداوت و نفرت
اُس کو اُلفت سے مارنا فن ہے

کار زارِ جہاں میں اب خود کو
پستیوں سے اُبھارنا فن ہے

بزمِ اغیار میں رقیبوں کو
خامشی سے پکارنا فن ہے

دل کے ہر کھیل میں یہاں رضیہ
جیتی بازی کو ہارنا فن ہے

○

یہاں پہ کب کوئی اُس کا کہیں ٹھکانا ہے
حصولِ قربِ محبت تو اِک بہانہ ہے

جو اِک جہاں کے لیے چارہ گر مسیحا تھا!
اُسی کے تیرِ ستم کا یہ دل نشانہ ہے

کبھی تھے ہم بھی زمانے کی ٹھوکروں کا شکار
پہ آج قدموں میں اپنے وہی زمانہ ہے

گھنے شجر کو گرانا ہو مشغلہ جس کا
اُسی کی شاخِ چمن پر تو آشانہ ہے

اُفق کے پار نظر پھر ٹھہر گئی جا کر
پھر اِک سفر پہ نئے اپنا دل روانہ ہے

○

چاند جیسی تیری صورت کو بھلانا مشکل
چاندنی چھائے تو پھر درد چھپانا مشکل

جب کبھی لوٹ گئے وادیٔ ماضی کی طرف
جاگتے ذہن کو اُس رات سلانا مشکل

اب تو آنکھیں بھی گئیں ہار بہت رو رو کر
یہ لگی آگ یہ دل کی ہے بجھانا مشکل

اب نہ وہ جوشِ محبت نہ وہ اندازِ جنوں
اب تو ہستی کا ہوا بوجھ اُٹھانا مشکل

زیست کے کھیل میں درکار ہے دانشمندی
بخت اِک بار جو روٹھے تو منانا مشکل

تو نے مجھ سے جو کیا وعدۂ اُلفت رضیہؔ
فی زمانہ ہے یہی بات نبھانا مشکل

•

O

سوچ پر برف جمی سی کیوں ہے
دل میں جذبوں کی کمی سی کیوں ہے

دُھند میں ذہن کے اِک یاد تری
مثلِ دیوار کھڑی سی کیوں ہے

تجھ کو بھولے ہوئے مدت گذری
اب بھی آنکھوں میں نمی سی کیوں ہے

تیری تصویر پرستش کے لیے!
گوشۂ دل میں سجی سی کیوں ہے

مصلحت عشق کا شیوہ تو نہیں
بات اب تک یہ بنی سی کیوں ہے

اِک معمہ ہی رہے گا رضیہؔ
گل پہ شبنم کی لڑی سی کیوں ہے

O

ہے عجب مرحلہ یہ شام ڈھلے
دل بجھے، جب کہیں چراغ جلے

جس کی سمتوں کی کوئی سمت نہیں
دل یہ لیکن اُسی کی سمت چلے

میں میسر اُسے ہوں کافی ہے
کیا ضروری کہ وہ بھی مجھ کو ملے

شہرِ سنگیں میں آج اے رضیہؔ
کیا خبر چاکِ دل سلے نہ سلے

○

شامِ غم بھی ڈھلے، ڈھلے نہ ڈھلے
زخمِ صد چاکِ دل، سلے نہ سلے

خونِ دل لحہ لحہ دے کر بھی
اُس کا یہ دیپ بھی، جلے نہ جلے

موڑ دینا رُخ زمانہ تم!
آفتِ زندگی ٹلے نہ ٹلے

وعدۂ حشر پر یقیں کیونکر
ہم کو منزل وہاں، ملے نہ ملے

○

نقشِ ماضی کا مٹاؤں کیسے
میں اُسے دل سے بھلاؤں کیسے

اُس نے محفل تو سجالی اپنی
بن کے مہمان میں جاؤں کیسے

چشم اشکوں سے بھی محروم ہوئی
آگ سینے کی بجھاؤں کیسے

مصلحت جس کی ہو بنیاد وفا
ساتھ اُس کا میں نبھاؤں کیسے

مبتلا کشمکشِ دل میں ہوئی
جشن میں سوگ مناؤں کیسے

دھڑکنیں ڈوب رہی ہیں رضیہؔ
کشتیِ دل کو بچاؤں کیسے

کربِ آگہی

ایک ایسا ہو جزیرہ کہ جہاں ہر اک پل
امن و چاہت کا دمکتا ہوا سورج نکلے
صبر و راحت سے مہکتی ہوئی ہر شام ڈھلے
چین کا سبزہ اُگے پھول وفاؤں کے کھلیں
ابرِ باراں کرے بوندوں کی مسلسل بارش
رقص میں جھومتے اشجار نئے رنگ بھریں
سازِ دل چھیڑتی جائے یہ معطر سی ہوا
گلی کوچوں میں کہیں گند کی بدبو نہ اُٹھے
گھر کے آنگن میں نہ گونجے کہیں سسکی کی صدا
بھوک اور پیاس سے گھائل نہ کوئی جسم رہے
کاش یونہی میں سدا آس کے بندھن میں رہوں
پر یہاں ریت پہ گھر کوئی بنائے کب تک
اِک نہ اِک روز حقیقت کا لیے آئینہ
مجھ کو اس خواب جزیرے سے گزرنا ہوگا!

○

دل میں جب یاد اُترتی جائے
رات آنکھوں میں گزرتی جائے

جب بھی محرومِ تماشا ہو نظر
زلفِ ایام بکھرتی جائے

زندگی میری، بھکارن کی طرح
اس کے ہی در پہ ٹھہرتی جائے

دیکھنے منظرِ غروبِ سورج
موج ساحل سے اُبھرتی جائے

بزم میں اُس کے چلے آنے سے
گیسوئے شام نکھرتی جائے

تھام کر ہاتھ وفا کا اُس کی
زیست کندن سی نکھرتی جائے

•

○

نگارِ زیست اگر یوں مدام رکھنا تھا
تو پھر نگاہ کی گردش میں جام رکھنا تھا

ہوس تھی پانے کی دل کو حیاتِ لاثانی
تو بابِ عشق میں اپنا بھی نام رکھنا تھا

خیالِ خام سہی پھر بھی دل کی تسکیں کو
کبھی تو ہم سے پیام و سلام رکھنا تھا

مسافرانِ محبت کو روکنے کے لیے
نظر میں صبح تو زلفوں میں شام رکھنا تھا

تلاشِ منزلِ مقصود جا بجا بے سُود
بس ایک کوچہء دل میں قیام رکھنا تھا

○

اِک نئے امتحاں کی فکر کریں
ہم بھی کارِ جہاں کی فکر کریں

کب میسر سکوں کی نیند اُنہیں
جو سدا کارواں کی فکر کریں

تنگ ہونے لگی زمین مگر
وسعتِ آسماں کی فکر کریں

گو پرندوں کا ہے مقام فلک
پھر بھی وہ آشیاں کی فکر کریں

جن لبوں پر سکوتِ لامحدود
وہ بھی حرفِ بیاں کی فکر کریں

اب تو موجوں کو سونپ دی کشتی
کیوں ہوا، بادباں کی فکر کریں

جذبِ انسانیت سے بیگانہ
اپنے ہی جسم و جاں کی فکر کریں

حاصلِ زیست کو بھلا بیٹھے
ہر گھڑی رائیگاں کی فکر کریں

اب یہی مقصدِ حیات ہوا
کچھ یہاں، کچھ وہاں کی فکر کریں

O

اِک عجب قصہ و کہانی ہے
بات دل کی خرد نے مانی ہے

درد آنکھوں سے جھانکتے رکھنا
کہ یہی دل کی ترجمانی ہے

جشنِ فتح مناؤ تم لیکن
میں نے کب اپنی ہار مانی ہے

دل بھی توڑا ہے چوڑیوں کی طرح
کہ یہاں ریت یہ پُرانی ہے

کب ٹھہرتا ہے ایک چوکھٹ پر
جس نے در در کی خاک چھانی ہے

کیوں مسلسل مسرتوں کی طلب
ہر خوشی جبکہ آنی جانی ہے

انجام

محبت کا جو بُت میں نے تراشا تھا عقیدت سے
اچانک گر پڑا وہ
ریت کے تودے کی مانند
میرے آگے
میرے قدموں میں
میں اپنے شاہکارِ عشق کے انجام پر
سچ ہے
نہ کھل کر ہنس سکی
نہ رو سکی
نہ کہہ سکی کچھ بھی!

○

مسیحا جاں سے اپنی جا رہا ہے
اندھیرا روشنی کو کھا رہا ہے

کیا آغاز جس نے اپنے ہاتھوں
وہی انجام کو پہنچا رہا ہے

نگاہِ لطف سے کوئی یہ دل کی
دبی چنگاریاں سُلگا رہا ہے

میں صدقے اُس ادائے بے رُخی کے
تڑپ کر جو مجھے تڑپا رہا ہے

مجھے جو منتشر کرنے چلا تھا
وہ دیکھو خود بکھرتا جا رہا ہے

جسے معدوم یہ دل کر چکا تھا
اُسی کا نقش بنتا جا رہا ہے

سرشتِ آدمی سے کیا* شکایت
جو پایا اُس نے وہ لوٹا رہا ہے

پناہیں اُس کی رضیہؔ کو میسر
جو ایندھن وقت کا دہکا رہا ہے

O

تسکین بے وجہ تو سکوں بے سبب ملے
اِس دامنِ خیال میں اِک شخص جب ملے

اِک اِس خیال نے ہمیں چونکا دیا بہت
پھر فرصتِ خیال ہمیں جانے کب ملے

کاٹی اِسی اُمید پہ طولِ شبِ فراق
اللہ زندگی میں نہ پھر ایسی شب ملے

دل کو ہوئی جو حسرتِ دیدارِ آشنا
رستے دیارِ دوست کے ہم کو عجب ملے

یوں تو ہر ایک گام میسر ہے سب کا ساتھ
پر جستجو ہے جس کی ہمیں جانے کب ملے

جن کو جہانِ عیش و طرب سے غرض نہیں
اُن کو ہی صبحِ عیش تو شامِ طرب ملے

ہم کو دلیلِ علم و سخن اس طرح سے دو
کہ مدعائے دل بھی ہمیں بے طلب ملے

سب کچھ ہمارے اپنے مقدر کا کھیل تھا
اِک وہ ہی مل سکا نہ ہمیں اور سب ملے

○

نہ کہکشاں سے نہ شمس و قمر سے ملتا ہے
وفا کا نور جو اُس رہ گزر سے ملتا ہے

ملا کے خاک میں ہم کو نہ خود پہ نازاں ہو
کہ ظرف مٹنے کا بابِ ہنر سے ملتا ہے

جلا جو دھوپ میں اوروں کے سائباں کے لیے
ہمارا دل اُس بوڑھے شجر سے ملتا ہے

اُسی کے در پہ وفاداریاں نثار کریں
کہ ہم کو درسِ وفا جس کے در سے ملتا ہے

ہے اپنے بس میں کہاں زندگی کے وار سہیں
یہ حوصلہ تو فقط اُس کے در سے ملتا ہے

کسی کسی کو میسر ہوا ہے اوجِ بشر
کب آدمی کا پتا ہر بشر سے ملتا ہے

کسی بھی جنتِ ارضی میں ہو نہیں ممکن
جو آدمی کو سکوں اپنے گھر سے ملتا ہے

بس ایک قدر یہی مشترک ہے دونوں میں
ہمارا زخم گلِ زخمِ تر سے ملتا ہے

اہلِ خرد

جدھر نگاہ اُٹھے غم کے سائے لہرائیں
کہیں کلی تو کہیں پھول دل کے مرجھائیں
کہیں پہ اشکوں سے خوشیوں کے رنگ ڈھل جائیں
کہیں پہ زخم دلِ چاک کے یہ دکھلائیں
کہیں یہ حرفِ شکایت لبوں تک لائیں
کہیں یہ وعدوں سے ہر روز دل کو بہلائیں
کہیں غریب شہر غربتوں سے مر جائیں
کہیں امیر متاعِ جہاں سے مٹ جائیں
مگر جو اہل خرد ہیں وہ حوصلے پائیں
قلم سے رنگ بھریں گفتگو سے سلجھائیں
بگڑتی بات بنانے کا ڈھنگ بتلائیں
شکارِ زیست کو جینے کے گُر بھی سکھلائیں

○

صدیوں سے رہا شوق جسے چارہ گری کا
پایا نہ کبھی اس نے ہنر بخیہ گری کا

اِک تیرے سوا سارے زمانے کو خبر ہے
عالم یہ ہوا ہم سے تیری بے خبری کا

جذبوں میں صداقت نہیں تاثیر ہو کیسے
ناحق ہی گلہ کرتے ہو تم بے اثری کا

ہر شے کو فنا ہے تو ہمیں ناز ہو کس پر
یہ زیست تو جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

دربارِ دل و جاں میں جو آنا تو سنبھل کر
نازک ہے بہت کام یہاں شیشہ گری کا

کانٹے سے کھٹکتے ہیں زمانے کی نظر میں
انجام یہ ہونا ہی تھا آشفتہ سری کا

کچھ دم تو ٹھہر حسرتِ دیدار ہو پوری
"کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا"

O

کٹے گا اب اکیلے ہی سفر کیا
رہے گی یوں ہی اپنی چشم تر کیا

عداوت بے رُخی اور سرد مہری
یہی سوغات ہوں گے ہم سفر کیا

یہ سوچو نفرتیں بونے سے پہلے
رہے گی شاخِ اُلفت بے ثمر کیا

ہوا محرم یہ سناٹا قفس کا
کریں اب اپنی فکرِ بال و پر کیا

سلیقہ ہم کو جینے کا سکھائیں
ہنر پائیں گے اتنا بے ہنر کیا

مسافر لٹ چکے ہیں منزلوں پر
رکھا ہے اب پسِ دیوار و در کیا

خبر پہنچی نہیں مٹنے کی تم تک
رہو گے ہم سے اتنے بے خبر کیا

اچانک اس قدر اتنی عنایت
ہماری زندگی ہے مختصر کیا

وہی یکسانیت ہے زندگی کی
سحر کیا، شام کیا، یہ دوپہر کیا

O

ہم بوجھ غمِ دل کا اُٹھائیں گے کہاں تک
خودکو سرِ ہستی سے مٹائیں گے کہاں تک

احساسِ غمِ ہجر مٹائے نہیں مٹتا!
اب دل کو کسی طور لبھائیں گے کہاں تک

جو راہِ طلب ہم کو کبھی راس نہ آئی
اس رہ پہ دل و جان گنوائیں گے کہاں تک

حاوی ہی رہی جور و ستم نظرِ کرم پر
اس جبرِ مسلسل کو بھلائیں گے کہاں تک

بڑھتے ہی گئے فاصلہ دل کے مراحل
ہم اُن کے تعاقب میں بھی جائیں گے کہاں تک

کچھ اپنی حدوں کا وہ تعین بھی تو کر لیں
ہم قامتِ دیوار بڑھائیں گے کہاں تک

خاموشی

دل کی شکستگی پہ یہ لب کھولنا نہیں
برپا ہوں دل میں حشر مگر بولنا نہیں
لب بن جب تلک رہیں اسرار ان میں ہو
کھل جائیں ایک بار تو پھر کچھ نہیں یقیں
کس سمت شخصیت کو بہا کر یہ لے چلیں
پھر اپنے آپ سے کبھی شاید ہی مل سکیں
خاموشیوں میں دل کا بہت شور ہے پنہاں
خاموشی جب تلک نہیں ٹوٹے عظیم ہے
خاموشی بول اُٹھے تو پھٹ جائے آسماں
لفظوں کے تیز شعلوں سے جل جائیں دو جہاں
پھر ہم نہ وہ نہ آپ، رہے چار سو دُھواں

○

غموں کا ذکر نہیں درد کا حساب نہیں
یقین کیجیے دنیا مگر خراب نہیں

وہیں وہیں، پہ ہے احساسِ تشنگی قائم
جہاں جہاں، یہ میسر مجھے عتاب نہیں

کسی کو پا کے کوئی ایسے مجھ کو بھول گیا
نصابِ زیست میں اسکی اب اپنا باب نہیں

ہوا ہے جب سے عیاں زندگی کا ہر پہلو
نظر میں دُور تلک اب سراب نہیں

عذابِ آگہی ذات کا شکار ہوں میں
عذاب میرے لیے اب کوئی عذاب نہیں

تمہارا عذرِ خموشی ہے بے سبب رضیہؔ
یہاں سوال کوئی اب تو لاجواب نہیں

•

فکر

مسلسل دستکوں سے ذہن پر
افکار کے در کھلنے لگتے ہیں
کبھی دم سادھ لیتے ہیں
کبھی کچھ کہنے لگتے ہیں
کبھی تو ٹھہر جاتے ہیں
کبھی ہم چلنے لگتے ہیں
کبھی ہنستے ہیں زوروں سے
کبھی پھر رونے لگتے ہیں

عجب اِک کرب سے ہم خود شناسی کے
گزرتے ہیں بکھرتے ہیں
اُجڑتے ہیں، سنورتے ہیں
کبھی ہم ذات کے پندار کا
اِک بُت بنا کر پوجتے ہیں اور
کبھی شرمندگی کی اوٹ میں
ہم زیست کے نا آشنا تاریک گوشوں کی
پناہیں مانگتے ہیں، چھپنے لگتے ہیں
عذابِ آگہی کے دور سے ہر پل گذرتے ہیں
کہ جب افکار کے در کھلنے لگتے ہیں!!

محبت مر نہیں سکتی

کبھی بھولے سے مت کہنا
محبت مر بھی سکتی ہے
محبت مر نہیں سکتی
محبت مر نہیں سکتی

محبت میں کمی آئے
بہت ممکن ہے یہ لیکن
محبت موت پا جائے
میں کیسے مان لوں کیونکہ
محبت سو تو سکتی ہے
محبت مر نہیں سکتی ہے

محبت شعلۂ جاں ہے
محبت عہد و پیاں ہے
محبت پیکرِ نوری
محبت جذبِ ایماں ہے
محبت دردِ یزداں ہے
محبت جذبِ لافانی
محبت سو تو سکتی ہے
محبت مر نہیں سکتی!

•

وہ جس نے خود ہی تھاما تھا
تمہارا ہاتھ اب لیکن
تمہیں وہ چھوڑ بیٹھا ہو
یہ منہ کو موڑ بیٹھا ہو
اندھیری راہ میں اس زیست کی
عہدِ وفا کو توڑ بیٹھا ہو
جسے تم زندگی سمجھے
وہ تم کو روگ بھی مانے

تمھیں محروم کر کے وہ
کھلی تازہ ہواؤں سے
سزا دے تم کو صبح و شام
نا کردہ گناہوں کی
تمھیں وہ قید کر کے
حبسِ تنہائی کی گھڑیاں دے
تمہاری شام شامِ ہجر کر دے
رتجگے دے دے
مگر پھر بھی اگر 'محبوب' ہے وہ
اور تمھیں اس سے محبت ہے
تو یہ سچ ہے
کہیں اس گوشۂ دل میں
محبت ہو گی خوابیدہ
محبت سو تو سکتی ہے
محبت مر نہیں سکتی
محبت مر نہیں سکتی!!

O

یہ دل جس کے ستم کا ہے نشانہ
کہاں آساں ہوا اُس کو بھلانا

اسے ہر دم بھلا دینے کی کوشش
اُسی کو یاد کرنے کا بہانہ

ہوا سب کچھ وہی حسب روایت
ہوا دے کر نشیمن کو جلانا

شگوفے خواہشوں کے شاخِ دل پر
نہیں آسان تھا اُن کو گرانا

تمنا ہمرہی کی بے سبب اب
کہ اپنا بوجھ ہے خود ہی اُٹھانا

گذر جائیں گے جب اس دہر سے ہم
کہانی اپنی دنیا کو سنانا

نتائج سوچ لو تم جانیں کیا ہوں
سرِ محفل اگر ہم کو بلانا

○

کسی گنتی میں کب گردانتے تھے
جنہیں ہم مدتوں سے جانتے تھے

سفر میں گو بظاہر ہمرہی تھے
مگر وہ ہم سفر کب مانتے تھے

کہاں ممکن تھی تکمیل تمنا!
وہ ہم کو جب ہم ہی سے مانگتے تھے

یہی تنہائی محفل کا سبب تھی
کبھی جو انجمن کی ٹھانتے تھے

حوالے کس لیے طوفاں کو کشتی
ہوا کا رُخ اگر پہچانتے تھے

○

قرینہ جینے کا مجھ کو اگر نہیں آتا
غبارِ راہ میں رستہ نظر نہیں آتا

مدارِ سوچ میں ہوں میں مسافر تنہا
یہ وہ سفر ہے جہاں ہمسفر نہیں آتا

پرند کرتے ہیں تعمیر آشیاں سے گریز
ہر ایسی شاخ سے جس پر ثمر نہیں آتا

ہے دامِ حلقہ زنجیرِ دوستاں جب سے
یہ دل بھی لوٹ کے اپنی ڈگر نہیں آتا

محبتوں میں اُجالوں کی بات مت کرنا
کہ اِن اُجالوں میں کچھ بھی نظر نہیں آتا

تیرے بغیر بھی نیرنگیِ جہاں ممکن
سکون دل کو کسی پل مگر نہیں آتا

مثالِ دشت ہوں بہتر ہے فاصلہ مجھ سے
یہاں پہ سایۂ دیوار و در نہیں آتا

○

وہ پانی کے گھر رہتا ہے
آنسو آنکھ میں تر رہتا ہے

کچھ نہ کچھ تو دل کے اندر
خیر نہیں تو شر رہتا ہے

مٹی، پانی، آگ، ہوا کا
پیکر کیوں خودسر رہتا ہے

دھڑکن اُس کی عرش کا مسکن
جس دل میں دلبر رہتا ہے

موسم وہ ہی سب سے بہتر
جو اپنے اندر رہتا ہے

رکھوں اُس کے نام کا تکیہ
یادوں کا بستر رہتا ہے

دل میں کوئی درد کی طرح
دردِ دل اکثر رہتا ہے

جس کا اپنا گھر نہیں کوئی
وہ بھی اپنے گھر رہتا ہے

اُس در پہ دستک مت دینا
اُس گھر میں پتھر رہتا ہے

تنہائی

اس رستے پر چلتے چلتے
مجھ کو یوں لگتا ہے جیسے
کتنی صدیاں بیت گئیں ہیں
کتنے لمحے، کتنے وقفے
کتنے گلیاں، کتنے رستے
کتنے ارماں، کتنی چاہت
کتنے وعدے، کتنے سپنے
کتنے رشتے، کتنے اپنے
پیروں کے چھالوں کی طرح
پھوٹ گئے ہیں
ضدی بچے جیسے یکدم روٹھ گئے ہیں
اِک اِک کر کے سارے ساتھی چھوٹ گئے
پر میں تنہا جانے کب تک
اس رستے پہ چلتی رہوں گی!

ہمت

میں نے سارے تالے پھینک دیئے ہیں
کھول دیئے ہیں
ذہنِ رسا کے سب دروازے
یادِ ماضی کو دے دی ہے آزادی
جب جی چاہے، بلا اجازت
دروازوں سے داخل ہو کر
مجھ پر دھاوا بولیں
حملہ آور ہوں
تا کہ میں بھی ساری طاقت

قوت اپنی یکجا کر کے
اُن کے مدِ مقابل آؤں
وار کروں اور وار سہوں
بازی ہاتھ آئے یا جائے
مارنے مرنے پر آمادہ
گو میں زیست کی شطرنج کا اِک
زخمی اور ادنی سا پیادہ!!

O

بہارِ نو میں جیسے گل کوئی کھلا ہی جاتا ہے
خیالِ یار سے دل اس طرح گھبرا ہی جاتا ہے

ہمارا جذبِ ایثار و وفا اب بوجھ ہے تم پر
محبت حد سے گزرے تو یہ لمحہ آ ہی جاتا ہے

اگر ضربِ زمانہ کی مسلسل یونہی بارش ہو
تو پتھر کا جگر بھی خوف سے تھرا ہی جاتا ہے

تنی گردن سے کب ممکن ہوا ہے مسئلوں کا حل
سرِ تسلیم خم ہو جائے تو پیار آ ہی جاتا ہے

چھپا کر پردۂ خنداں میں آخر کب تلک رکھیں
سرِ مژگاں ہمارا خونِ دل بھی آ ہی جاتا ہے

غمِ فرقت کے لمحوں میں گزاری زندگی جس نے
اسے قربت کا اِک لمحہ سدا بہلا ہی جاتا ہے

لبِ گویا کو سی لینا ہی بہتر بزمِ یاراں میں
وگرنہ شکوۂ دل لب تلک پھر آ ہی جاتا ہے

جہاں پر تشنگیِ روح کا دستِ طلب اُٹھے
وہاں پر سایۂ ابرِ محبت چھا ہی جاتا ہے

O

خزاں نہ آئے سدا موسمِ بہار رہے
دلوں کو دورِ محبت بھی سازگار رہے

سکون و عشرتِ دونوں جہاں نصیب رہیں
دل و دماغ پہ خود اپنا اختیار رہے

دیوارِ دل نہ شکستہ کسی گمان سے ہو
کچھ اتنا آپ کی ہستی پہ اعتبار رہے

مزاجِ دوست جو برہم اُدھر کبھی ہو اگر
اِدھر نہ دل کو کسی طور پھر قرار رہے

وہ بزمِ ناز میں آئے اور آ کے لوٹ گئے
یہ اور بات کہ ہم وقفِ انتظار رہے

کبھی قریب کی جرأت نہ جس سے کر پائے
یہ کیا کہ وہ ہی طلبگارِ اعتبار رہے

جنونِ شوق کے اس اژدھام میں رضیہ
جو زخم ہم کو ملے دل کے آر پار رہے

جدا ہونا ضروری ہے

جدا ہونا ضروری ہے
جدا ہونا ضروری ہے
میری راہیں الگ ہیں
اور تمہارے راستے کچھ اور
رہیں مل کر یونہی باہم
نہیں ممکن کسی بھی طور
گو ہم یوں تو ہمیشہ سے
تمہارے تھے تمہارے ہیں
پہ اب دوری ضروری ہے
جدا ہونا ضروری ہے

چھپا لیں اپنے جذبوں کو
زمیں کی گود میں اس دم
مگر مٹی یہ ظالم ہے
نہیں ایسی جگہ کوئی
جہاں یادوں کو دفن کر کے
ہم چپ چاپ سو جائیں
مگر مجبوری یہ اپنی ہے
جدا ہونا ضروری ہے
ڈبو دیں اپنی اُلفت کو
کسی گہرے سمندر میں
سمندر سے ہے کب ممکن
کہ وہ اُلفت کی موجوں کو
کسی لمحے، کسی ساعت
نہ پھر ساحل پہ لے آئے
عجب ہے کشمکش لیکن
جدا ہونا ضروری ہے

جلا دیں اپنی چاہت کو
لگا دیں آگ اُلفت کو
مگر کب ہے یقیں دل کو
کہ ایندھن وقت کا اپنی
بجھا دے گا لگی دل کی
کہیں اِک اِک گزرتا پل
نہ آتش اور بھڑکا دے
بجھا دینا ضروری ہے
جدا ہونا ضروری ہے

•

قحط ہو لفظِ 'اُلفت' کا
تو شاید مسئلہ حل ہو
نگاہوں کی تپش
لفظوں کی نرمی
آہ کی گرمی
نظر کی پیاس، دل کی آس
سب نایاب ہو جائیں

نہ کوئی آس رہ جائے
نہ کچھ اُمید قائم ہو
جسے اپنا کہا تھا
اب اُسے کھونا ضروری ہے
جدا ہونا ضروری ہے
جدا ہونا ضروری ہے

سمجھوتہ

مجھے اُس رقص کرتے چاند کا ماتم نہیں کرنا
وفا کی رہ گذر کے چھوٹنے کا غم نہیں کرنا
سلگتی شام کی اس آنچ میں ہرگز نہیں جلنا
لبوں پر مہرِ خاموشی لگی
کچھ بھی نہیں کہنا
اکیلے راستوں پر
دیر تک اور دور تک چلنا پڑے لیکن
مجھے تو صبر کرنا ہے
مجھے تو شکر کرنا ہے
مجھے اس طور جینا ہے
مجھے اس طور مرنا ہے

خود کلامی

خیالوں کی حسیں وادی سے
جب بھی میں گزرتی ہوں
کبھی تنہا نہیں ہوتی تو میرے ساتھ ہوتا ہے
بہت ہی پاس ہوتا ہے
میری سانسوں سے بھی زیادہ
مجھے تیری تپش محسوس ہوتی ہے
بہت مجبور کرتی ہے
بہت معذور کرتی ہے
نگاہیں شدتِ احساس سے پھر جلنے لگتی ہیں

کبھی جلتے شرارے جھولتے ہیں میرے عارض پر
ٹکا کر انگلیوں کو
زور سے میں اپنے بالوں میں
کبھی آنسو بہاتی ہوں
کبھی گھبرانے لگتی ہوں
بھٹکتی ہوں سرابوں میں
کبھی میں تھم سی جاتی ہوں
اچانک جم سی جاتی ہوں
کہ جیسے
لفظ اندھے ہو رہے ہیں موٹی کتابوں میں
میں اپنے آپ سے کچھ کہہ نہیں پاتی
بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں
ذہن گو کہ زبانِ بے زباں سے بولتا ہے
خزینے دل کے سارے کھولتا ہے
میں پھر بھی کچھ نہیں کہتی
میں پھر بھی کچھ نہیں کہتی

○

نقشِ ماضی کا وہ سماں نہ رہا
دل محبت کا ترجماں نہ رہا

پھر اُداسی نے بال کھول دیئے
اب اُجالوں کا آسماں نہ رہا

عارضِ گل کو کس نے نوچ دیا
دے خبر کون، باغباں نہ رہا

شدتِ ضبطِ غم نے مار دیا
اب کوئی اپنا رازداں نہ رہا

ذہن آمادۂ بغاوت ہے
دل مہرباں تھا، مہرباں نہ رہا

رات دن غم کی آگ جھلسائے
دور تک کوئی سائباں نہ رہا

جب ہوئی حسرتِ جبیں سائی
دسترس میں وہ آستاں نہ رہا

تغیر

زندگی کے نئے اجنبی راستے
جانے کیوں اپنے اپنے سے مجھ کو لگے
ان پہ پھیلی خموشی، سکوں، چاندنی
روح میں جیسے میری اترتی گئی
اس مقدس سے ماحول میں گھل گئی
سر سے پاؤں تک جیسے میں ڈھل گئی
بغض، کینہ، عداوت، حسد اور گماں
میری ہستی سے پل میں جدا ہو گئے
میرے اندر کا موسم بدلنے لگا
دردِ جاں قطرہ قطرہ پگھلنے لگا
صاف شفاف سی برف گرنے لگی
میں بدلنے لگی، میں بدلنے لگی

O

شاخِ تنہا پر بسیرا چاہیے
اس پہ سایہ پھر گھنیرا چاہیے

ظلمتِ شب سے گزرنے کے لیے
اس کی یادوں کا سویرا چاہیے

روشنی جس کی پسِ پردہ رہے
زندگی کو وہ اندھیرا چاہیے

ہر جہنم سے گزر جائیں گے ہم
شرط ہے بس ساتھ تیرا چاہیے

O

ترے دیار میں کب ہوش کا ٹھکانا ہے
جنوں بھی حد سے گزرنے کا اِک بہانا ہے

ہمارے ظرف کو تم آزمانے آئے ہو
ہمیں تو درسِ محبت تمہیں سکھانا ہے

مرے مزاج کا موسم جو راس آجائے
تو برملا یہ کہو گے بڑا سُہانا ہے

گزر رہے ہیں اسی کشمکش میں دن میرے
تمہارے قرب میں تم سے ہی دُور جانا ہے

بچا کے کیسے بھلا دامنِ سفید رکھوں
کہ بارِ تہمتِ دنیا ہی جب اُٹھانا ہے

نگارشاتِ محبت عجیب ہیں رضیہ
کہ وہ ہی بات عیاں ہے جسے چھپانا ہے

•

O

خنجر بکف رہے نہ ستم آشنا رہے
ہم یوں بھی زندگی سے نبرد آزما رہے

کس درجہ بے نیاز رہے ہم سے عمر بھر
کہنے کو یوں تو لوگ سبھی ہمنوا رہے

کیونکر ہوں درمیان میں حائل یہ فاصلے
جب بن کے کوئی سینے میں دل کی صدا رہے

مثلِ چٹان جب رہے خاموش عمر بھر
لب پر گلہ کوئی دمِ آخر بھی کیا رہے

میں بندِ غم کی قید سے آزاد ہو رہوں
اب گردشِ حیات نہ زنجیر پا رہے

○

ہوائے تند تجھے ہر دیا بجھانا ہے
مجھے چراغ نہیں دل یہاں جلانا ہے

نئی اُمنگ، نئی لو، نئی ترنگ لیے
روش پہ فکر کی اپنے قدم جمانا ہے

شکن زدہ نہ جبیں ہو خیال رکھنا ہے
کہ مسکراتے ہوئے بوجھِ غم اُٹھانا ہے

وفا سے روشنی، اُلفت سے رنگِ خوش لے کر
دلِ شکستہ کے در و دیوار سجانا ہے

وہ اِک حسین تخیل وہ ایک دلکش خواب
جو مجھ سے روٹھ چکا ہے اُسے منانا ہے

میں سوچتی ہوں سمندر کو دیکھ کر اکثر
خبر کسے ہے کہ اس پار کس کو جانا ہے

مرا مزاج جدا ہے زمانے والوں سے
میرا تو دُور کہیں اور ہی ٹھکانا ہے

O

خزاں نصیب بہاروں میں جی نہیں لگتا
نظر فریب نظاروں میں جی نہیں لگتا

حیا کا رنگ کہ سرخی ہو عارضِ گل کی
کسی بھی حسن کے پاروں میں جی نہیں لگتا

گری ہے ٹوٹ کے جب سے شجر سے شاخِ اُمید
گلوں کی تازہ قطاروں میں جی نہیں لگتا

رہے ہیں موجِ تلاطم کے درمیاں ہر دم
سو اب سکوتِ کناروں میں جی نہیں لگتا

کسی کی یاد کی لو سے ہے شمعِ دل روشن
یہ مہر و ماہ ستاروں میں جی نہیں لگتا

نہ جانے بات ہوئی کیا جو دل کو ٹھیس لگی
کہ آج اپنے ہی پیاروں میں جی نہیں لگتا

ہوئی ہے دل کو تمنائے ترکِ دونوں جہاں
سو زندگی کے اشاروں میں جی نہیں لگتا

O

موجِ گرداب سے اب مجھ کو نکالے کوئی
ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سنبھالے کوئی

زندگی جانے یہ موقع مجھے پھر دے نہ سکے
بزمِ یارانِ محبت میں بلا لے کوئی

شام ہوتی ہے تو پیغام صبا دیتی ہے
گوشۂ جاں میں تو اِک شمع جلالے کوئی

کیا ہی اچھا ہو جو افسانہ دلِ راز رہے
قصۂ دل نہ سرِ عام اُچھالے کوئی

بس اسی آس پہ اِک عمر بسر کر ڈالی
زندگانی کے اندھیروں کو اُجالے کوئی

کب تلک خاک بنے ان کا مقدر رضیہؔ
اب تو پلکوں میں مرے اشک سجالے کوئی

○

کبھی جو راہِ وفا میں نشیب پا لینا
ہمارا جذبِ محبت بھی آزما لینا

سجھائی دے گا نہ رستہ اندھیری راتوں میں
جو ہو سکے تو یہ قندیلِ دل جلا لینا

دیارِ دوست کا ہنگام بھی نظر میں رہے
سکونِ دل کے لیے جب کبھی دوا لینا

وفورِ غم سے چھلکتی ہوئی نگاہوں سے
بھڑکتی آتشِ قلب و جگر بجھا لینا

تمہارا ساتھ کسی موڑ پر نہ چھوڑیں گے
یہ اپنا وعدہ ہے کوئی بھی راستہ لینا

نہیں ہیں ساعتِ گزراں جو لوٹ بھی نہ سکیں
کسی بھی وقت، کسی پل ہمیں بلا لینا

اِک برہن

بادل جب بھی ٹوٹ کے برسیں
نینوں کے یہ ساگر چھلکیں
اودی اودی کالی گھٹائیں
چٹکی لیتی سرد ہوائیں
ماضی کا آنچل لہرائیں
دل میں میٹھا درد جگائیں
پھول پہ بھنورے شاخ پہ چڑیاں
رِم جھم یہ بوندوں کی لڑیاں
اور میں پیاسی
اِک برہن سی
جیسے دُلہن
بن ساجن سی

فرار

جب رات ستارے آنچل میں
چمکائے ہوئے آجاتی ہے
تب اپنی یہ ویراں آنکھیں
اِک جھیل کنول بن جاتی ہیں
اور دل کی پیاس بجھاتی ہیں
جب ٹھنڈی ٹھنڈی پگلی ہوا
شاخوں پر پھول کھلاتی ہے
تب فکر کے بھورے ماضی کے
اوراق پلٹنے لگتے ہیں
پھر تیری یاد ستاتی ہے

جب سناٹوں میں یادوں کا
اِک شور بپا ہو جاتا ہے
تب میری روح کے اندر سے
اِک چیخ اُبھرنے لگتی ہے
جو تن من کو سلگاتی ہے
جب ساون بھادوں موسم میں
ہر چیز نکھرنے لگتی ہے
تب دل کے اُجڑے آنگن میں
احساسِ شکستہ کے پھیکے
سب رنگ نکھرنے لگتے ہیں
جب صبح کا سورج کھڑکی سے
کمرے میں داخل ہوتا ہے
تب ظلمتِ شب کے جادو سے
جیسے میں نکل سی جاتی ہوں
پھر دنیا میں کھو جاتی ہوتی ہوں
اپنے سے جُدا ہو جاتی ہوں!

نتیجہ

دل کو آئینہ اگر کہتے ہو
توڑتے کیوں ہو اسے متواتر
کہ یہ آئینہ اگر ٹوٹ گیا
کچھ بھی میرا تو نہیں بگڑے گا
تیری تصویر بکھر جائے گی!!!

○

سمندروں کے سفر سے جو لوٹ کے آنا
تم اپنے ساتھ محبت کی سیپیاں لانا

کشش ہو حلقۂ گرداب میں بلا کی مگر
لبِ کنار سے منہ پھیر کر چلے آنا

کبھی جو ترکِ محبت کا حوصلہ ہو اگر
بس ایک بار گلی سے مری گذر جانا

تمہارا قصۂ دل تو لگا تھا افسانہ
تمہارے حرفِ محبت کو معتبر جانا

سراب بن کے یہ دل کو نہ دے سکے دھوکا
حقیقتوں کو محبت کی ایسے پا جانا

ہر ایک دور میں بس ایک مرحلہ تھا کٹھن
نظر بچا کے نظر سے تری گزر جانا

غمِ نارسائی

کبھی تھی میں گنگناتا نغمہ تمہارے اس سازِ دل کا مدھم
تھی چارہ گر کی طرح تمہارے ہر ایک زخمِ جگر کا مرہم

کبھی تھی چاہت کا عکس تیری کبھی میں قالب کی جان تیری
محبتوں کی حکایتوں کی زمیں تری آسمان تیری

مگر وہ لمحے کہاں کہ اب تو سبھی نظارے بدل گئے ہیں
نہ جانے کتنے دلوں کے ارمان دل ہی دل میں مچل گئے ہیں

تمہارا انداز بے نیازی مری وفا کا صلہ نہیں ہے
یقین جانو کہ تم سے کوئی مجھے تو پھر بھی گلہ نہیں ہے

شب و سحر اور یہ شامِ ہجراں بڑے سکوں سے گذر رہی ہیں
زمیں کے سینے پہ بن کے بوندیں تمہاری یادیں بکھر رہی ہیں

○

شبِ فراق میں ہم خود کو یوں جگاتے ہیں
تھپک تھپک کے تری یاد کو سلاتے ہیں

تمہارے نام کسی طرح بھی نہ حرف آئے
ہر ایک تہمتِ غم اس لیے اُٹھاتے ہیں

ہم اپنی خوبیِ تقدیر آزمانے کو!
ہوا کے دوش پہ اکثر دیے جلاتے ہیں

جنہیں نہ آیا کسی درد کی دوا کرنا
اُصولِ چارہ گری وہ ہمیں سکھاتے ہیں

ہوئے تھے جن کے لیے دو جہاں سے بیگانہ
نظر میں طنز لیے ہم پہ مسکراتے ہیں

بچا سکیں گے یقیناً نہ یہ دلِ سادہ
کہ رنگِ حسن کی وہ تتلیاں اُڑاتے ہیں

انہیں تو شیشہ دل توڑے مدتیں گزریں
پہ ہم تو آج تلک کرچیاں اُٹھاتے ہیں

ہم اس کی شانِ کریمی کے معجزے کے سبب
اندھیری رات میں جگنو سے جگمگاتے ہیں

نصیحت

کبھی تم اپنی اس دیوارِ دل پر
کوئی تصویر آویزاں نہ کرنا

کہ جو تصویر بھی دل میں بسے گی
تمہیں ہر پل ہر اک لمحہ ڈسے گی

کبھی کھل کر تمہیں رونے نہ دے گی
سکوں سے اِک گھڑی جینے نہ دے گی
نگاہوں میں اندھیری رات ہو گی
لبوں پر پھر فغاں کی بات ہو گی

گلابی رنگ پھیکا زرد ہو گا
عجب سا دل میں ہر دم درد ہو گا
کسی سے سامنا ہو گا کہیں پر
پشیمانی عیاں ہوگی جبیں پر

نہ تم خود پر کبھی اِترا سکو گی
جسے اپنا کہا، نہ پا سکو گی
اگر چاہو خوشی کا سانس لینا
محبت کا زہر ہرگز نہ پینا

•

خدارا اپنی اِس دیوارِ دل پر
کوئی تصویر آویزاں نہ کرنا!

○

زیست کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں
زخم سینے کے چھپائے ہوئے ہیں

جن کو ہم سے کوئی مطلب نہ غرض
بزم میں لوگ وہ آئے ہوئے ہیں

خندۂ لب تو انہی کا شیوہ
زخم جو دل میں چھپائے ہوئے ہیں

اس طرف بھی تو کوئی نظرِ کرم
بزم میں ہم بھی تو آئے ہوئے ہیں

گو بظاہر تو ہوئے مہر بہ لب
دل میں اِک حشر اُٹھائے ہوئے ہیں

چشمِ بیتاب کی یہ قوس و قزح
نذر کرنے تمہیں لائے ہوئے ہیں

سب کی نظروں کا بنے ہیں مرکز
جو نظر سب سے چُرائے ہوئے ہیں

جن کی تعبیر بھی ناممکن وہ!
خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے ہیں

○

کاش ہم نے تمہیں سمجھا ہوتا
درد پھر دل میں نہ اتنا ہوتا

راہِ اُلفت پہ قدم کیوں بڑھتے
لوٹ جانے کا جو رستا ہوتا

پھر طلب تیری نگاہوں کو ہوئی
کاش سب کا یہی چہرہ ہوتا

کس طرح شاملِ محفل ہوتے
بزم میں کوئی تو اپنا ہوتا

ضرب تھم جاتی نفس کی رضیہؔ
زخمِ جاں اتنا تو گہرا ہوتا

O

جب تلک تیرا انتظار رہا
دل بھی پیہم یہ بے قرار رہا

سلسلہ دل سے دل کا ٹوٹ گیا
اب وفا پر نہ اعتبار رہا

دھوپ میں ہم جلے خزاں رُت کی
تم پہ تو سایۂ بہار رہا

لمحۂ وصل کو نصیب کہاں
جو شبِ ہجر پر نکھار رہا

بے سبب ہی سہی مگر دل کو
کیوں گلہ تم سے صد ہزار رہا

جو بظاہر چٹان کی صورت
اُس کے اندر بھی اِک شرار رہا

کیا کہیں ساعتِ محبت کا
تا دمِ مرگ انتظار رہا

○

طبیعت میں بغاوت* اور کتنی
محبت سے عداوت اور کتنی

چھلکتا جا رہا ہے ساغرِ غم!
دلِ تشنہ کی حاجت اور کتنی

ستم کے وار جسم و جاں پہ روکیں
دکھائیں ہم مہارت اور کتنی

نگاہوں کی زبانِ بے زباں سے
محبت کی وضاحت اور کتنی

ہوا انبارِ روز و شب میسر
ہو فطرت کی عنایت اور کتنی

جبینِ ناز ترے آستاں کو
تخیل میں عبادت اور کتنی

گناہ کے بعد توبہ کی اجازت
ہو انساں سے رعایت اور کتنی

O

تیری دنیا میں جینے کا ہُنر پانا ضروری ہے
ہمیں اس کے اثر سے اب نکل جانا ضروری ہے

کہاں تک ترکِ اُلفت کا سبب بتلائیں دنیا کو
بس اتنا جان لو اس سے بچھڑ جانا ضروری ہے

وہ اُس کا وعدہ اُلفت جو ہر اِک شے سے بڑھ کر تھا
بنائے مصلحت اُس سے مکر جانا ضروری ہے

مخالف سمت چلنے کی بنا لی اب تو عادت سی
وہ جب آئے اِدھر، اپنا اُدھر جانا ضروری ہے

کبھی تو چاند تاروں سے کبھی پھولوں سے باتیں کیں
کہ اُس آسیب تنہائی کو بہلانا ضروری ہے

پرستش جس کی ہم نے کی وہ بس اِک آدمی نکلا
سو اس کا حجرۂ دل سے اُتر جانا ضروری ہے

مجالِ ترک اذنِ آرزو کیسے ہو ممکن جب
کوئی نظروں ہی نظروں میں کہے 'آنا ضروری ہے'

سفر

مجھے تو زیست کے صحرا سے اب گزرنا ہے

سو میرے پاؤں تلے فرشِ مخملیں نہ بچھے
نہ میرے صحنِ تمنا میں کوئی دیپ جلے
نہ میری آنکھوں سے چھلکے کبھی پیار کا رنگ
نہ میری جسم میں خوشبو بسے بہاروں کی
نہ میری روح میں اُترے کسی کی ذات کا رنگ
ملے نہ دھوپ کی گرمی نہ چھاؤں کی لذت
نسیمِ صبح کی میں دسترس میں آ نہ سکوں

حسین شامِ طرب چھو سکے کبھی نہ مجھے
میں اپنی ذات میں بے ننگ و نام بے پرواہ
چلوں تو راہ میں ناآشنائے غم ہو کر
نہ مجھ کو سود و زیاں کا کوئی حساب رہے
گو میرے حصے میں دنیا کا ہر عتاب رہے
کچھ اس طرح سے مجھے بے نیاز جاں ہو کر
چمن چمن سے نہیں دشت سے گزرنا ہے

○

مٹنے کے بعد ہم ترے تیور سمجھ سکے
غرقاب ہو کے کیا ہے سمندر سمجھ سکے

دنیا کے روبرو رہے معصوم و بے ضرر
ہے کون ہم سے جو تمہیں بہتر سمجھ سکے

ناآشنائے فہم جو تم ہو تو کیا عجب
کب اس کلام کو یہ سخنور سمجھ سکے

جو بے نیازِ جذبہٗ لطف و سرور ہے
نیرنگیٔ خیال وہ کیونکر سمجھ سکے

ایسا ہو کوئی ہم کو میسر جہاں میں جو
اس دھڑکنِ حیات کے جوہر سمجھ سکے

اس روح میں سُرور کی جو تشنگی رہی
ممکن نہیں وہ بادہ و ساغر سمجھ سکے

جذبوں کو ٹھیس کیسے پہنچتی ہے طنز سے
اس بات کو کہاں کوئی پتھر سمجھ سکے

○

سکوتِ جاں میں اِک طوفاں بپا ہے
اور آنکھوں میں سمندر سا رُکا ہے

اُسی کی روشنی ہے ظلمتوں میں
جو اپنی آگ میں جل کر بجھا ہے

نہ کیوں میں معاف کردوں خوش دلی سے
کہ وہ سارے زمانے سے جدا ہے

جسے پوشیدہ رکھا دھڑکنوں میں
میری آنکھوں سے اکثر جھانکتا ہے

شبستانِ محبت مت اُجاڑو
یہی جینے کا اب اِک آسرا ہے

حروفِ دل سنو گے دھڑکنوں میں
سماعت کا اگر زنداں کھلا ہے

دلوں کی پارسائی غیر ممکن
کہ یاں ہر شخص پتھر کا خدا ہے

○

کہیں بحرِ جنونِ آرزو بہتا نہیں ملتا
وگرنہ کون دنیا میں تہہِ دریا نہیں ملتا

ہم آشفتہ سروں کو کار زارِ زیست میں اکثر
کبھی منزل نہیں ملتی، کبھی رستا نہیں ملتا

ہجومِ دوستاں میں اُس کے روز و شب گزرتے ہیں
بیاں کیا حال دل کا ہو کہ وہ تنہا نہیں ملتا

بظاہر تو متاعِ دین و دنیا دونوں حاصل ہیں
حسیں تعبیر جس کی ہو وہی سپنا نہیں ملتا

بھرم تشنہ لبی کا ہم نے رکھا ہے یہی کہہ کر
کہ پیاسے کو زمانے میں کبھی دریا نہیں ملتا

○

دل کو کسی کے قُرب کی ہے آرزو بہت
پر کیا کریں کہ پاسِ حدِ آبرو بہت

کم حوصلہ نہ کر دے کہیں گردشِ حیات
گردش میں ہم نے اس لیے رکھا لہو بہت

کچھ بانصیب پہنچے مقامِ عروج تک
منزل کی یوں تو سب کو رہی جستجو بہت

پہچاننے کو. کب ہوئیں درکار مدتیں
انسان کے پرکھنے کو اِک گفتگو بہت

وہ اور ہوں گے جن کو ہے جنت کی آرزو
ہم کو تو سنگ وخشت کے یہ رنگ و بو بہت

چارہ گری کا ہم نہ ہنر پا سکے کبھی
ہر چند کی ہے کوششِ دامن رفو بہت

•

فرض

پیچ در پیچ مسائل میں سدا
زندگی نے مجھے الجھائے رکھا

اور میں پیٹ کے دوزخ کے لیے
روز و شب تنگ سیاہ رستوں پر

لے کے امید کا چھوٹا سا دیا
کبھی اس گوشے، کبھی اس گوشے

عزتِ نفس و انا ساتھ لیے
بیج محنت کے سدا بوتی رہی

بستر عیش کے سپنے لے کر
فرشِ سنگیں پہ سدا سوتی رہی

اپنی ہستی کو مٹا کر اکثر
کارِ دشوار کو آسان کیا

اپنے بچوں کے تعیش کے لیے
ہو کے بیگانۂ آرام و سکوں

ہر گھڑی کام، فقط کام کیا
آج جب بچے جواں سال ہوئے

بے نیازانہ یہ کہہ کر گزرے
آج تک آپ نے جو کچھ بھی کیا

ہم پہ احسان نہیں، نہ کوئی قرض
یہ حقیقت میں ہے ماں باپ کا فرض

آئینہ

ہر حقیقت سے پردہ اٹھاتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دِکھاتا رہا

جس پہ تکیہ کیا وہ ہوا دے گیا
جس کو اپنا کہا وہ دغا دے گیا
جس سے الفت ہوئی وہ سزا دے گیا
دل یہ صدمے وفا کے اٹھاتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دکھاتا رہا

اقتدارِ زمانے کی خاطر کوئی
اپنے اقدار پامال کرنے لگا
چند لمحوں کے اس عیش کے واسطے
عاقبت کوئی اپنی گنواتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دکھاتا رہا

وہ کہ شطرنج کا تھا کھلاڑی بڑا
اس نے چالیں پنپنے کی ایسی چلیں
اک زمانے کو حیراں ہراساں کیے
چال مہروں کو اپنی سکھاتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دکھاتا رہا

جاہ و حشمت کی اس کو طلب تھی بہت
ہم سے خائف رہا وہ سدا بے سبب
راہ کا ہم کو پتھر سمجھتے ہوئے
اک جہاں کو تماشہ دکھاتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دکھاتا

ظلم کی تیز آندھی میں اک دن یہاں
زیست کے سارے جلوے بکھر جائیں گے
حشر کے قبل ہی حشر برپا ہو گر
ایک مظلوم کو یوں ستاتا رہا
وقت کا آئینہ کیا دکھاتا
ہر حقیقت سے پردہ اٹھاتا رہا

میرے شعر

یہ غزلیں، یہ نظمیں
یہ اشعار میرے
تمھیں کیا خبر ہے
کہ تخلیق ان کی
ہوئی کس طرح سے
یہ سمجھے ہو تم
فکر کو میں نے اپنی
کیا ہے رنگیں لفظوں سے پیہم
جو جذبات دل میں

چھپے تھے ہزاروں
انہیں آج شرفِ صدا دیدیا ہے
حقیقت مگر یہ تو ہرگز نہیں ہے
کہ اشعار میرے
وہ موتی، وہ سیپی
جو بکھرے ہیں ساحل پہ
ہر سمت، ہر سو
جنہیں دیکھ کر
خوش گماں ہو گئے ہو
کہ پایا ہے تم نے
سراغِ تہہِ دل
مگر ہے جو طوفان
اس دل کے اندر
وہاں تک تمہاری
رسائی کہاں ہے !!

O

عقل کو آپ نہ زحمت دیجیے
دل کو میزانِ محبت کیجیے

سونپ کر میری محبت مجھ کو
پھر مرے شہر سے ہجرت کیجیے

اپنی آنکھوں سے ہر اک خوابِ طرب
دل نہ چاہے بھی تو رخصت کیجیے

پوچھیے حال سرِ راہگزر!
اک ذرا اتنی مروت کیجیے

ہو کے منسوب مرے نام سے کیوں
خود کو وابستۂ شہرت کیجیے

کیا تھے اسبابِ شکستِ الفت
مختصر ان کی وضاحت کیجیے

لمحۂ ہجر کی تنہائی میں
خود کو درماندۂ وحشت کیجیے

○

دل کو حاصل ہے عجب سی اِک خوشی
رقص میں ہو جیسے ساری زندگی

روشنی در روشنی کے سلسلے!
پہلوئے فطرت میں کتنی بے خودی

عارضِ گل، رنگ سے رنگیں ہوئے
حسنِ قدرت میں عجب اک دلکشی

صاف اور شفاف سے ماحول میں
یوں لگے جیسے خدا بھی سادگی

دُھند کی چادر ہٹا کر فکر سے
میں نے پائی ظلمتوں میں روشنی

○

ملیں جو زخم اپنوں سے ہمیشہ یاد رکھنا ہے
اگر اس زندگی کو صورتِ فریاد رکھنا ہے

تمہارے قُرب کے موسم کی چاہے کوئی بھی رُت ہو
تمہارے ہجر میں دل کو یہ لیکن شاد رکھنا ہے

کمالِ ضبط پر اپنے پگھل جائیں یہ پتھر تک!
جواں یوں حوصلہ دل کا تمہارے بعد رکھنا ہے

کبھی اے کاش قدرت کا کوئی قانون ایسا ہو
کہ زنجیرِ قفس ہو جو اسے آزاد رکھنا ہے

ہر اِک لمحہ اسی الجھن میں تو شیطان رہتا ہے
بشر کو کس طرح سے زیست میں برباد رکھنا ہے

○

شاہکار

چاند، بادل، ہوا
پھول مہکی فضا
کل تلک کتنے پھیکے
ادھورے لگے
آج جب سے
تری سانس اُن میں گھلی
تیرا چہرہ
کنول پھول بن کر کھلا
تیری آنکھوں سے
روشن سویرا ہوا
تیری خوشبو سے مہکی فضا ہر طرف
تیری معصوم مسکان سے جانِ جاں
شاہکار حقیقی مکمل ہوا !

O

گرداب میں موجوں کو کنارا نہیں ملتا
آشفتہ مزاجوں کو سہارا نہیں ملتا

اس وقت تلک راہِ محبت پہ چلیں گے
جب تک کہ پلٹنے کا اشارا نہیں ملتا

امکانِ مساوات محبت بھی ہے بے سُود
اب اپنے مقدر کا ستارا نہیں ملتا

جس میں ہو عیاں جذبۂ اخلاص و اخوت
اب روئے زمیں پر وہ نظارا نہیں ملتا

جو جی میں ہے کر گزرو اسی وقت اے رضیہؔ
پھر گزرے ہوئے وقت کا دھارا نہیں ملتا

O

ہوا کے رُخ پہ زمانے کا بادباں نہ ہوا
تو کاروانِ محبت رواں دواں نہ ہوا

وہ تم سے اپنی جدائی عجب قیامت تھی
پھر اس کے بعد کوئی اور امتحاں نہ ہوا

بجھی ہیں کتنی خموشی سے دھڑکنیں دل کی
کہیں نہ آگ لگی اور کہیں دھواں نہ ہوا

ہوا ہے جذبوں کا فقدان اس قدر اب تو
ہمارا جذبِ محبت بھی جاوداں نہ ہوا

زمانہ اس کو صفِ دشمناں میں گنتا ہے
مگر یہ دل کہ کبھی اس سے بدگماں نہ ہوا

اڑان جس کی فضاؤں میں آخری حد تک
پرند پھر وہ کبھی وقفِ آشیاں نہ ہوا

دلِ حزیں نے تمنا کی جس کی چاہت کی
ستم یہ کیا ہے وہی شخص مہرباں نہ ہوا

○

موڑ آئے رہِ اُلفت میں یہ کیسے کیسے
کہ رہے تم سے مراسم نہ وہ پہلے جیسے

ہم کو اِک شخص بھی باوصفِ محبت نہ ملا
یوں تو ٹکراتے رہے بھیڑ میں ایسے ویسے

اب تو سامانِ سفر باندھ کے تیار ہوئے
شکر ہے عمر بھی یہ کٹ گئی جیسے تیسے

O

کہیں جو جذبِ محبت کو ترجمان ملے
زمین بوس مسافر کو آسمان ملے

جو وار کرتے عدو پر تو کس طرح کرتے
ستم کے تیر، ستم ہے کہ بے کمان ملے

خبر ہوئی نہ ہمیں کیسے کب کہاں سے لگے
شکستہ روح پہ زخموں کے وہ نشان ملے

خیال و خواب ہر اِک داستانِ مہر و وفا
پیامِ عشق کو ممکن نہیں زبان ملے

رہِ وفا کے مسافر عجب صفت نکلے
ہر ایک موڑ پہ ہمکو تو بے تکان ملے

ہمیں قبول ہے صحرائے زیست کا یہ سفر
اگر تمہاری محبت کا سائبان ملے

•

۸/اکتوبر۲۰۰۵ء

اکتوبر آٹھ کی وہ صبح قیامت کی تھی
جس نے چند لمحوں میں صدیوں کی تباہی کر دی
اپنی ماں جیسی زمیں طیش میں ایسے آئی
پھٹ گئی، زیر کئے قریئے، شہر
کھول کر اپنا شکم بھر لیے معصوم بشر
جھٹکے دے دے کے گرائے پتھر
اور پھر ڈھیروں تلے مٹی کے
زندہ درگور کیا لوگوں کو
موت نے گود لیا بچوں کو
گھر زمیں بوس ہوئے
لوگ زمیں دوز ہوئے

چند لمحوں میں کہیں، کچھ نہ بچا
سسکیاں، چیخ اور آہوں کے سوا
بے کفن لاشوں کو دفنایا گیا
اپنے دل پر یہ ستم ڈھایا گیا
لوگ سب خاک کی پوشاک ہوئے
بچ رہے جو وہی غمناک ہوئے
سانحہ اتنا بڑا ہے کہ زباں گنگ ہوئی
عقل یہ دنگ ہوئی، روح بھی بے رنگ ہوئی
اب بجز اس کے نہیں کچھ ممکن
ہم کو ہمت سے اٹھانا ہے قدم
سانحہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے
اب ہمیں اُس کو نبھانا ہے بہم
اپنے زخموں کو بھلا کر یکسر
قوم کے دل سے مٹانا ہے غم
پھر بصد عجز کرنی ہے دعا
ہم گناہ گاروں پہ مولا، ہو کرم

موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

حسنِ فطرت کا چہرا بگڑتا گیا
نقش بستی و قریہ اجڑتا رہا
زندگی غم کی تصویر بنتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

کتنے انفاس تن سے نکلتے رہے
کتنے پرنور چہرے اُجڑتے رہے
بین بچوں پہ ماں اپنے کرتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

باپ کاندھوں پہ لاشوں کو لے کر چلے
کتنی لاشیں ہیں جن کو کفن نہ ملے
مانگ عورت کی ہرپل اجڑتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

آج ویران آبادیاں ہو گئیں
کیسی جاگی ہوئی بستیاں سو گئیں
اور اجل سے زمیں گود بھرتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

ایک لمحے میں ساری خوشی کھو گئی
ڈھیروں مٹی تلے زندگی سو گئی
خاک ہی خاک پر سو بکھرتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

میرے مولا مجھے ظرف سہنے کا دے
موت کے درمیاں زندہ رہنے کا دے
دل سے بس اِک دعا یہ نکلتی رہی
موت چاروں طرف رقص کرتی رہی

عید

ساعتِ عید کی مبارک باد
قوم کو دیں تو کس طرح سے دیں

جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے
ریت، مٹی کا اِک دھواں سا ہے
موت کا قافلہ رواں سا ہے
ہنستے بستے مکان ڈھیر ہوئے
کیسے انساں زمیں میں زیر ہوئے
خونِ معصوم سے کتابوں کے
کتنے اوراق ہو گئے رنگین
دلنشیں اور حسین چہروں پر
آگیا وقت کس قدر سنگین

تن پہ کپڑا نہ سر پہ چادر ہے
دل میں لبریز غم کا ساغر ہے
آفتِ ناگہاں کے سائے ہیں
بوجھ پندار کا اٹھائے ہیں

زیست تصویرِ غم ہے کیا کیجے
عید کی خوش نوید کیا دیجے

دُعا

وفا کے پھول نیکی کے ثمر دے
الٰہی بس یہی رختِ سفر دے

غموں کی رُت کو خوشیوں میں بدل دوں
مجھے جینے کا اِک ایسا ہنر دے

جو پتھر دل ہو اس کو موم کر دوں
میری نطق زباں میں وہ اثر دے

جو ٹکرائے ہمیشہ گردشوں سے
مجھے وہ قوتِ قلب و جگر دے

ہو پہچان خیر و شر اور جھوٹ سچ کی
مجھے جوہر شناسی کی نظر دے

رہوں گی زیرِ احساں زندگی بھر
تشکر سے بھرا اِک دل اگر دے

سفر میں گو بہت تاریکیاں ہیں
مگر منزل پہ تو نورِ سحر دے

O

غمِ جہاں میں تجھے زیست کا سبب رکھا
بجز طلب کہ تیری خود کو بے طلب رکھا

نثار اس پہ زمیں آسماں کی ہر تخلیق
زمینِ دل پہ قدم جس نے باادب رکھا

تمہارے طرزِ تغافل کی ہر حکایت کو
بیان کر نہ سکے، ہم نے زیرِ لب رکھا

برائے نام سہی حال دل تو سن لیتے
پہ اتنا پاسِ محبت بھی تم نے کب رکھا

کسی بھی طور منانا جو جشنِ غم ٹھہرا
تو دل کی شمعِ جلا کر نگارِ شب رکھا

اسی کو حوصلۂ دل کی انتہا کہیے
کہ اپنا نوحۂ غم شاملِ طرب رکھا

کہیں جو جذبِ محبت کو ترجمان ملے
زمیں بوس مسافر کو آسمان ملے

جو وار کرتے عدو پر تو کس طرح کرتے
ستم کے تیر، ستم ہے کہ بے کمان ملے

خبر ہوئی نہ ہمیں کیسے کب کہاں سے لگے
شکستہ روح پہ زخموں کے وہ نشان ملے

خیال و خواب ہر اک داستانِ مہر و وفا
پیامِ عشق کو ممکن نہیں زبان ملے

رہِ وفا کے مسافر عجب صفت نکلے
ہر ایک موڑ پہ ہم کو تو بے تکان ملے

ہمیں قبول ہے صحرائے زیست کا یہ سفر
اگر تمہاری محبت کا سائبان ملے

کیا خاک سنواریں گے مقدر وہ کسی کا
جن ہاتھوں کو گلدان سجانے نہیں آتے

اُس کو بھی چھوڑ دوں یہ متاعِ جہاں تو کیا
جب آبرو کی بات، انا کا سوال ہو

مِرا مزاج ہے موجوں سے کھیلتے رہنا
طلب سکوں ہو جسے وہ مِری حیات نہیں